مقالۂ افتتاحیہ

دارالمصنّفین پر ظلم

: رئیس احمد جعفری

دارالمصنفین اعظم گڑھ، اپنی نوعیت کا واحد تحقیقی اور تخلیقی ادارہ ہے اور گزشتہ پچاس سال کی مدت میں اس ادارے نے اردو زبان کا دامن انمول موتیوں سے بھر دیا ہے۔ اگر دارالمصنفین، اور اس کے عظیم کارناموں کو ذرا دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے تو تاریخ کے کوچے میں خاک اڑنے لگے گی، اور تحقیق کا میدان سنسان نظر آئے گا۔ تنقید و سوانح کے سدا بہار چمن کے گل بوٹے مرجھائے ہوئے نظر آنے لگیں گے۔

دارالمصنفین نے سیرۃ النبیؐ، اسوۂ صحابہ، سیر الصحابیات، سیر انصار، تاریخ اسلام (شاہ معین الدین احمد ندوی) تاریخ صقلیہ، اور دوسری بلند پایہ اور گراں بہا کتابیں شائع کر کے نہ صرف اردو زبان پر احسان عظیم کیا ہے، نہ صرف ملتِ اسلامیہ کو ممنون کیا ہے، نہ صرف وطن اور قوم کی شاندار خدمت کی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا مرتب کر دی ہے جس کی نظیر نہ عربی میں ہے، نہ فارسی میں، نہ ترکی میں، اردو زبان اگر آج فخر سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے تو اس میں اس کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین کے بوریہ نشینوں کی استقامت، عزیمت اور خدمت کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔

دارالمصنفین کی تعمیر و استحکام میں مولانا شبلی مغفور کی عملی سرگرمیوں کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا ان کے شاگردانِ رشید علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کو ہے۔ ایک نے یکسوئی کے ساتھ تحقیق و تاریخ اور اسلامیات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ دوسرے نے تعمیر و انتظام و انصرام

کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی، اور اس طرح ایک دور افتادہ اور پسماندہ ضلع میں ایک ایسا "المجمع العلمی" بن گیا جسے دنیا کی بڑی بڑی اکیڈمیاں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

قیام دار المصنفین کے بعد عملی سرگرمیوں کا آغاز ہی ہوا تھا کہ مولانا شبلی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ابھی سیرۃ النبی کی پہلی جلد بھی لکھ نہیں پائے تھے۔ لیکن ان کے کام کو مولانا سید سلیمان ندوی نے آکر اس شان سے سنبھالا کہ سارا ملک اعتراف پر مجبور ہو گیا۔

دار المصنفین کے خاک نشین علماء نے کبھی دریوزہ گری نہیں کی۔ چندے کے رجسٹر نہیں کھولے صوبائی یا مرکزی حکومت سے امداد نہیں طلب کی۔ سرمایہ داروں اور دولت مندوں کی طرف دست سوال نہیں بڑھایا۔ صرف اپنے دست و قلم پر بھروسہ کیا اور ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے ہر تحریص و ترغیب سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہے۔ کچھ اسلامی ریاستیں تھیں جو اس سعادت میں حصہ لینا اپنے لیے موجب فخر سمجھتی تھیں۔ باقی سارے مصارف خود دار المصنفین کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ اور مصارف بھی کاغذ، کتابت اور طباعت کے سوا کیا تھے؟ یہاں کے ارباب کار جو تنخواہ لیتے تھے وہ صرف قوت لایموت کو کفایت کرتی تھی۔ اور اسی پر یہ قانع تھے۔ نہ عثمانیہ یونیورسٹی کی دلکشی انھیں اپنی طرف کھینچ سکی۔ نہ حیدر آباد کا منصب گراں ان کا دامن پکڑ سکا۔ نہ راس مسعود کا اصرار انھیں جنبش دے سکا۔ یہ فقیری میں مگن تھے، اور اپنی ملت کی ذہنی تربیت میں لگے ہوئے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد حالات بدل گئے۔

ریاست حیدر آباد پولیس ایکشن کی نذر ہو گئی۔ وہاں سے جو گرانٹ ملتی تھی بند ہو گئی۔

بھوپال مدھیہ پردیش کا ایک شہر اور وہاں کا فرماں روا "ایک معزز شہری" بن گیا۔ اس دربار سے جو خراج عقیدت سال کے سال آیا کرتا تھا، اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

معارف اور کتابوں کے خریداروں میں زندہ دلان پنجاب کا بہت بڑا حصہ تھا۔ تقسیم کے بعد کی دشواریوں کے باعث ان کا نمبر صفر تک پہنچ گیا۔ کیونکہ منی آرڈر اور وی۔ پی کا سلسلہ مسدود ہو گیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور شہروں میں علمی ذوق رکھنے والے جو لوگ بستے تھے ان کی

ایک معقول تعداد "غمِ عشق" کے ہاتھوں پاکستان آگئی۔ اور جو رہ گئی اسے "غمِ روزگار" میں مبتلا ہو جانا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ہاتھ سے گئے:

دل کو روؤں یا جگر کو میرؔ میری دونوں سے آشنائی ہے

دار المصنفین کا تصنیفی کام ان روح فرسا اور جگر فگار حالات میں مولانا معین احمد ندوی نے جس ایثار، قناعت اور حوصلے کے ساتھ اپنے جواں حوصلہ، اور جواں ہمت رفقاء کے ساتھ جاری رکھا وہ انہی کا کام تھا۔ یہ حضرات اگر پاکستان آجاتے تو ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اور کہیں زیادہ آرام و فراغت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھیں نہ مستقبل کی فکر تھی۔ نہ حال کا اندیشہ، نہ فرزند و زن کا خیال، ہر فکر اور ہر خیال سے بے پروا ہو کر یہ اپنے کام میں لگے رہے۔ آخر ہندوستان کے تباہ حال اور خستہ و درماندہ مسلمانوں کا بھی ان پر حق تھا، یہ کیونکر اسے گوارا کر لیتے کہ ہندوستان کی سرزمین کو اسلامیات کے منبع سے اور اردو زبان کے بیش بہا سرمائے سے محروم کر دیتے؟ ایثار و استغناء کی یہ شاندار مثال صرف وہی لوگ پیش کر سکتے تھے جو کسی عظیم مقصد کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ سیم و زر کے ڈھیر سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

آمدنی گھٹتی گئی۔ یہ اپنے ذاتی مصارف گھٹاتے گئے۔ کام کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ اور تحقیق و تخلیق کا کاروبار جاری رہا۔ دشواریاں پیش آئیں۔ نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی جبینِ استقلال پر شکن تک نہ آئی۔

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات ایسے نازک مرحلے پر تقسیم کے فوراً بعد داخل ہو گئے ——— اور اب تک ہیں ——— کہ پاکستان خواہش اور جذبے کے باوجود کوئی مالی مدد اس ادارے کی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اخلاقی امداد سے اس نے گریز بھی نہیں کیا۔ جب غلام محمد صاحب گورنر جنرل اور ممتاز حسن صاحب سیکریٹری فنانس، اور چودھری محمد علی وزیر مالیات تھے تو پاکستان کے کسی ناشر نے سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد چھاپ دی۔ ظاہر ہے اس طرح اگر یہ سلسلہ چل پڑتا تو دار المصنفین کو غیر معمولی نقصان پہنچ جاتا اور اسے اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن اس کا بروقت تدارک کر دیا گیا۔ اور امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب اس طرح کی

حرکتوں کا اعادہ نہیں ہوگا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تدارک میں خود بعض مقامی ناشرین پیش پیش تھے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ

تھا جو ناخوب بہ تدریج وہی خوب ہوا

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ کسی ناشر نے سیرۃ النبیؐ کا "خلاصہ" چند سو صفحات میں شائع کر دیا ہے۔ یہ ظلم پہلے ظلم سے بھی کئی گنا بڑھا ہوا ہے۔ دار المصنفین تو اسے سہہ لے گا مگر کیا حکومت بھی اسے گوارا کرے گی؟ ہمارے ناشرین کرام بھی اسے برداشت کریں گے؟ ملک کا دانشور طبقہ بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج نہیں بلند کرے گا؟ ارباب علم اور اصحاب ذوق بھی خاموش بیٹھے رہیں گے؟

ابھی کچھ عرصہ ہوا دار المصنفین نے اپنی طلائی جوبلی منائی تھی۔ اس تقریب میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر افضل اقبال بھی بہ نفس نفیس شریک ہوئے تھے اور انھوں نے خریداری کتب کے لیے حکومت کی طرف سے ایک گراں رقم کا آرڈر دے کر خیر سگالی اور علم دوستی کا مظاہرہ بھی کیا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت پاکستان دار المصنفین کے علمی کارناموں کو قدر اور وقعت کی نظر سے دیکھتی اور حوصلہ افزائی کا مستحق سمجھتی ہے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ اس سلسلے میں فوری قدم اٹھائے۔ اس کی معقول صورت ہمارے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ لاگت کے داموں پر مطبوعہ نسخے خرید لیے جائیں، اور کسی جگہ محفوظ کر دیے جائیں اور آئندہ کے لیے اس طرح کی جرأت رندانہ پر قدغن لگا دی جائے۔ یہ دار المصنفین کا نقصان نہیں ہے ہمارے اخلاق اور اقدار کا زیاں ہے۔ اگر ہم اس ادارے کی مالی مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ اسے مالی نقصان نہ پہنچائیں۔

ہمیں امید ہے ان دردمندانہ گزارشات پر ملک کے دانشور، کتب فروش، ناشرین، اصحاب علم، ارباب ذوق اور کارپردازان حکومت سنجیدگی سے غور کریں گے۔ جس کسی نے یہ کتاب چھاپی ہے ہم اسے بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے ہو گئی۔ لیکن اس غلطی کا تدارک بہ ضروری ہے اور اس کی معقول صورت یہی ہے کہ لاگت پر سارے مطبوعہ نسخے خرید لیے جائیں۔ اور ضایع کر دئے جائیں